Volume 02, Issue 03,
October-December 2024
PP: 98-114
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

اکیسویں صدی کی چند اہم آپ بیتیوں کا جائزہ

A Review of Some Most Important Autobiographies of the 21st Century

Dr. Azaadar Hussain [1]Hina Ameer[2]

Article History

Received
12-11-2024

Accepted
21-11-2024

Published
30-11-2024

Abstract & Indexing

Abstract

Autobiography, as a literary genre, has gained significant prominence in Urdu literature in the 21st century, offering profound insights into personal narratives and cultural dynamics. This paper reviews some of the most important autobiographies in modern Urdu literature, highlighting their unique styles, thematic richness, and contributions to the genre. Rasheed Amjad's autobiographical works stand out for their traditional approach, reflecting deep connections with heritage and civilization, and for their edifying and instructive tone. Ali Muhammad Siddiqui's contributions emphasize authenticity and coherence, setting a benchmark for organized and credible autobiographical writing. Saadat Hasan Manto's controversial yet compelling autobiographical pieces, shaped by accusations of obscenity and his reflective responses, underscore the provocative and transformative potential of the genre. Similarly, Javed Iqbal's autobiography provides invaluable insights into his life and legacy, gaining additional significance due to his status as Allama Iqbal's son, thereby blending personal narrative with national history. Ahmed Basheer's autobiographical work, presented in the form of a biographical novel, captivates readers with its innovative narrative style and emotional depth. This review examines these works' contributions to Urdu literature, emphasizing their role in enriching cultural discourse and their enduring impact on the evolution of autobiography as a literary form.

Keywords

Urdu Literature, Autobiography, Rasheed Amjad, Ali Muhammad Siddiqui, Saadat Hasan Manto, Javed Iqbal, Ahmed Basheer, Literary Genre, Personal Narratives, Cultural Heritage.

[1]***E.S.T G.H.S. Sabowal, Sargodha.***
azaadar.ranahussain@gmail.com
[2] ***MPhil Scholar, University of Sargodha.***
muhammadtaseer17@gmail.com

All Rights Reserved © 2023 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

HIRA INSTITUTE of Social Sciences Research & Development

OPEN ACCESS

اکیسویں صدی میں عالمی سیاسی و سماجی سطح پر کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں نے اردو ادب کی شعری و نثری اصناف پر بھی کئی اثرات مرتب کیے۔ اردو ادب میں آپ بیتی بھی گزشتہ صدی سے ایک اہم صنف کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ ذیل میں اکیسویں صدی کی چند اہم آپ بیتیوں کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے، جن میں تمنا بے تاب از رشید امجد، بلا کم و کاست از مہدی علی صدیقی، اپنا گریباں چاک از جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال، دِل بھٹکے گا از احمد بشیر، نشانِ جگر سوختہ از ڈاکٹر سلیم اختر شامل ہیں۔

تمنا بے تاب از رشید امجد

رشید امجد کا اصل نام اختر رشید تھا اور قلمی نام رشید امجد تھا۔ اُردو ادب میں بطور افسانہ نگار اور نقاد شہرت حاصل کی۔ اُن کے افسانوی مجموعوں میں بیزار آدم کے بیٹے، ریت پر گرفت، سہ پہر کی خزاں، پت جھڑ میں خود کلامی، بھاگے ہے بیاباں مجھ سے، دشتِ خواب، کاغذ کی فصیل، عکسِ بے خیال، گمشدہ آواز کی دستک، ست رنگے پرندے کے تعاقب میں اور ایک عام آدمی کا خواب شامل ہیں۔ اُن کی تنقیدی کاوشوں میں نیا ادب، رویے اور شناختیں، یافت و دریافت، شاعری کی سیاسی و فکری روایت شامل ہیں۔ اِس کے علاوہ "میرا جی شخصیت اور فن" جو کہ اِن کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے بطور نقاد اُردو ادب میں اِن کی پہچان کرواتا ہے۔ ان کی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے 2006ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی اور اس سے پہلے 95-1994ء میں نقوش ادبی ایوارڈ سے نوازا۔

ان کی تخلیقات میں ایک آپ بیتی بھی شامل ہے، جس کا پہلا ایڈیشن 2001ء میں "عاشقی صبر طلب" کے عنوان سے 327 صفحات پر مشتمل شائع ہوئی اور اسی کا دوسرا ایڈیشن 2003ء میں "تمنا بے تاب" کے عنوان سے ترمیم و اضافے کے ساتھ حرف اکادمی، راولپنڈی سے 352 صفحات پر مشتمل شائع ہوئی۔

رشید امجد کی طبیعت میں ایک بے چینی اور اضطراب پایا جاتا ہے، جس کا اظہار انہوں نے آپ بیتی میں جگہ جگہ بیان کیا ہے، اِسی اضطراب کی بنا پر انہوں نے آپ بیتی کا عنوان تمنا بے تاب کے نام سے رکھا۔ یہ منفرد نام غالب کے شعر سے لیا گیا ہے۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دِل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

آپ بیتی کے بارے میں تعارف کراتے ہوئے اس کے عنوان کے بارے میں رشید امجد خود لکھتے ہیں کہ:

> معروف معنوں میں یہ خود نوشت نہیں بلکہ یادیں، خیالات، تجزیے اور مختلف اشیاء کے بارے میں میرے نکتہ ہائے نظر ہیں، جن میں میری نجی زندگی اور میرا عہد دونوں شامل ہیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا، سُنا اور محسوس کیا اُسے بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا۔ اِس میں زمانی ترتیب نہیں، جس طرح کوئی ذکر آیا اور بات سے بات نکلی ہے۔ میں نے اُسی طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ عاشقی کے لیے جو صبر طلب چاہیے، وہ مجھ میں نہیں۔[1]

رشید امجد کے اِس بیان سے یہ پتا چلتا ہے کہ آپ بیتی میں زمانی ترتیب نہیں ہے، واقعات میں تسلسل نہیں ہے۔ جس طرح انہیں باتیں یاد آتی گئیں، وہ لکھتے گئے فنی لحاظ سے یہ آپ بیتی کی خامی ہے، ترتیب نہ ہونے کے باعث بعض اوقات آپ بیتی طبیعت میں بے زاری پیدا کر دیتی ہے، اس لیے بعض ناقدین تمنا بے تاب کو آپ بیتی نہیں بلکہ یاداشتوں میں شامل کرتے ہیں۔

آپ بیتی کے اہم کرداروں میں رشید امجد کے والد، والدہ، علیا چاچا اور مصنف کے اُستاد غلام رسول طارق ہیں۔ رشید امجد نے اپنے والد کو آپ بیتی میں فعال اور متاثر کن کردار کے طور پر پیش نہیں کیا، ان کے مطابق وہ درویش قسم کے انسان تھے، ابتداء ہی سے الگ انداز میں زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے تھے، بچوں کی تربیت کی طرف اُن کا خیال بہت کم جاتا تھا۔ آپ بیتی کے شروع میں رشید امجد اپنے والد کے بارے میں

چند اہم باتیں بیان کرتے ہیں، جس سے والد کے مزاج اور مذہب کے بارے میں آگاہی ملتی ہے کہ وہ ہندو جوتش سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، بیٹے کی پیدائش پر جنتری بنوائی اور جنم پتری کے مطابق نام رکھا لیکن اس کے باوجود رشید امجد نے آپ بیتی میں کہیں بھی اپنی صحیح تاریخ پیدائش بیان نہیں کی۔

عام طور پر بچے والدین میں سے اپنی والدہ کے ساتھ بہت زیادہ مانوس ہوتے ہیں لیکن رشید امجد نے آپ بیتی میں اپنی والدہ سے واضح بے زاری کا اظہار کیا ہے، جس کی وجہ انہوں نے احساسِ ملکیت اور علیا چاچا سے دور کرنے کی بتائی ہے۔ والدہ کے اس احساس ملکیت کی وجہ سے رشید امجد کے دِل میں خوف وہراس، احساسِ محرومی اور بے اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ بچپن کے اِس خوف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> رات کو یونہی میری آنکھ کھلتی میں خاموشی سے بستر سے نکل کر سیڑھیوں پر آجاتا۔ نیم تاریک سیڑھیوں میں میں دُبک کر بیٹھا ہوا، خوف مجھے دبوچ لیتا۔ میں آہستہ سے آوازیں دیتا علیا چاچا۔۔۔ علیا چاچا۔۔۔ چاچا بھی شاید میری آواز کے منتظر ہوتے، ایک لمحہ میں وہ سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے میرے پاس پہنچ جاتے اور ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے۔ گود میں اُٹھا کر چپ چاپ اپنے ساتھ لے جاتے۔ مجھے فوراً نیند آجاتی۔ صبح امی انہیں بھی ڈانٹتیں۔۔۔ تم کیوں لے کر گئے اِسے اور مجھے بھی، سیڑھیوں میں جرمن متو ہے، اب گئے تو پکڑ لے گا[2]

علیا چاچا کا اصل نام علی محمد تھا۔ وہ رشید امجد کے گھر ملازم تھے لیکن گھر کے فرد کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ مصنف کے بچپن کے واقعات میں علیا چاچا سے مصنف بہت مانوس نظر آتے ہیں، بلکہ اپنی والدہ سے نفرت کی وجہ بھی علیا چاچا سے دوری بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ آپ بیتی میں ایک اور اہم کردار مصنف کے ایک اُستاد غلام رسول طارق کا ہے، جن سے رشید امجد کی ملاقات 1955ء میں میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج اصغر مال میں ہوئی۔ ان کے کردار اور اخلاق سے رشید امجد بہت متاثر تھے اور ان کی صحبت میں رشید امجد نے ایف اے اور بی اے کا امتحان پاس کیا۔

رشید امجد نے آپ بیتی میں اپنی سوانح عمری بیان کرنے کے علاوہ اپنے عہد کے ادبی منظر نامے کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے، اس سلسلے میں حلقہ اربابِ ذوق جس کا وہ حصہ بھی رہے اور اُس دور کی اہم ادبی تحریکوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ بچپن سے وہ جن ادبی شخصیات سے ملے اور متاثر ہوئے ان کا ذکر آپ بیتی کو ایک تاریخی حیثیت دیتا ہے، اِن میں ممتاز مفتی، پریم چند، احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، وحید قریشی، افتخار عارف، ضیاء جالندھری، منشایاد، سعادت حسن منٹو، فتح محمد ملک، جمیل یوسف، انور سدید، پروین شاکر، جمیل جالبی، اعجاز راہی انعام الحق جاوید، کشور ناہید، وزیر آغا، ابو الخیر کشفی، مرزا حامد بیگ اور احباب کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ اس سلسلہ میں اعجاز راہی کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، جو کہ ان کے پہلے دوست اور حلقہ اربابِ ذوق میں انہیں متعارف کروانے والے تھے۔ بعد ازاں حلقہ ارباب ذوق کی محفلوں اوران میں شامل لوگوں کا بہت تفصیل کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔ آپ بیتی کا بڑا حصہ حلقہ اربابِ ذوق اور اس کے ارد گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔

رشید امجد نے ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنے والے رسائل و جرائد پر بھی روشنی ڈالی ہے، اِس ضمن میں وہ اوراق کی ادبی خدمات کا تذکرہ اس انداز میں کرتے ہیں:

> اوراق کے فکر انگیز اداریوں نے جدیدیت کے وہ راہنما اُصول وضع کیے ہیں جنہوں سے کئی انتہا پسندوں کو اعتدال کی راہ دکھائی۔ میرے ادبی سفر اور پہچان میں اوراق کا بڑا ہاتھ ہے۔ میرے خیال میں شب خون اور اوراق دو ایسے رسالے ہیں جن کے ذریعے میں نے اپنا بہترین اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد سیپ ہے۔[3]

اوراق کا ذکر کرنے کے علاوہ رشید امجد نے ڈاکٹر وزیر آغا سے اپنی قربت کا بھی اظہار کیا ہے۔ آپ بیتی میں احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کی ادبی چپقلش میں وہ وزیر آغا کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کی اس چپقلش کو ختم کیا جا سکتا ہے لیکن بعض ادیب اس راہ میں رخنہ ڈالے ہوئے ہیں، اس میں رشید امجد فنون سے وابستہ ادیبوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

رشید امجد نے آپ بیتی میں نہ صرف ادبی حالات و واقعات کو بیان کیا ہے، بلکہ سیاسی واقعات کو آپ بیتی کا حصہ بناتے ہیں۔ اس سلسلے میں قائد اعظم کے انتقال کی خبر سُن کر وہ زار و قطار رونے لگے اور افسردہ ہو گئے، 1951ء میں لیاقت علی خان کی شہادت کا بھی ذکر ملتا ہے۔ سیاست میں رشید امجد ذوالفقار علی بھٹو سے متاثر نظر آتے ہیں، کیوں کہ وہ جمہوریت پسند مزاج کے حامی تھے۔ آپ بیتی میں کئی جگہ پر لگنے والے مارشل لاء کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ خاص طور پر جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ اُس دور میں اہلِ قلم پر لگنے والی پابندیوں اور اس کے خلاف احتجاج کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ملک کے نظام میں موجود خامیوں کی نشان دہی کی ہے، تاہم کئی جگہ پر بحث میں طوالت کا عنصر آ جاتا ہے۔ آپ بیتی میں جرمن متو کے بارے میں بیان کیا گیا ہے، رشید امجد کی ماں اُن کو جرمن متو سے ڈراتی تھیں۔ اس دور میں انگریزوں کی دشمنی کی وجہ سے ہٹلر کو پسند کیا جاتا تھا، کیوں کہ جنگ کی تباہی لوگوں کے دل پر گہرے اثرات ڈالے ہوئے تھی، لہٰذا جرمن متو خوف کی علامت بن گیا تھا۔ رشید امجد اس بارے میں لکھتے ہیں:

> امی مجھے ڈراتیں کہ یہاں جرمن متو رہتا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ اس کے کیا معنی ہیں لیکن میری چشم تصور نے اُس کی جو تصویر بنائی تھی وہ بڑی ڈراؤنی تھی۔ ایک لمبے قد کا شخص، لال انگارہ آنکھیں، ہاتھوں میں بجتے ہوئے کڑے اور ایک ڈنڈا۔ اس جرمن متو نے ساری زندگی مجھے ڈرایا اور یہ اندھیرا کبھی میرے اندر سے نہ نکل سکا۔[4]

اس بیان میں رشید امجد نے جرمن متو کا ایک خیالی خاکہ اس خوب صورتی سے پیش کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے جرمن متو کی تصویر آ جاتی ہے۔ رشید امجد راولپنڈی اپنے رشتہ داروں کو ملنے آئے تھے اور فسادات کے شروع ہونے کے باعث یہاں ہی بس گئے، اس کا ذکر اُنہوں نے آپ بیتی میں کیا ہے۔ اس دوران وہ معاشی طور پر بہت کمزور ہو گئے، حتّٰی کہ نوبت ورک شاپ پر کام کرنے کی آ گئی۔ معاشی حالات کا ذکر کرتے ہوئے وہ مختلف ملازمتوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتے ہیں۔ لیکن اس سب کے ساتھ بھی مصنف نے اپنی محنت اور تعلیم جاری رکھی۔

آپ بیتی کے جس حصے میں مصنف نے اپنے معاشی حالات کا ذکر کیا ہے وہاں پر بعض واقعات ایسے بیان کیے ہیں کہ بیان میں صداقت محسوس ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ گھر سے بھاگ جانے کی کوشش کی۔ گھر سے برتن چُرا کر بیچنے کی عادت پڑ گئی۔ ان عادات کی وجہ مصنف نے آپ بیتی میں جو بیان کی ہے وہ والد اور والدہ کی لڑائی اور والدہ کی سختی تھی۔ چوری کی عادت جو کہ معاشرتی حوالے سے بہت بُری عادت ہے لیکن رشید امجد نے اپنے اُسلوب کی مدد سے اس بُرائی کو اس انداز میں بیاں کیا ہے کہ قاری کو رشید امجد سے نفرت کا احساس نہیں ہوتا۔

بعض واقعات عورتوں کے بارے میں ہیں۔ جن میں اپنے معاشقوں کا ذکر کیا ہے، بچپن سے ہی انہیں اپنے سے بڑی عمر کی عورتوں کو خط لکھنے کی عادت ہو گئی تھی ان کے بیان کے مطابق پہلا عشق سکول میں اُستانی سے ہوا، جن کو فرضی خط لکھتے تھے۔ نفسیاتی حوالے سے دیکھا جائے تو وہ بڑی عمر کی عورتوں کو خط اُس محبت کو پانے کے لیے بھی لکھتے تھے جو کہ والدہ کے روپ میں انہیں نہ مل سکی۔ محبت کے حوالے سے اپنی ایک کلاس فیلو کو "کچی مونگ پھلی" کہتے تھے۔

رشید امجد نے آخر میں اپنی ازدواجی زندگی کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن یہاں آ کر واقعات میں یک دم بہت تیزی آ گئی ہے، وہ جلدی جلدی اپنی بیوی رُخسانہ اور اُوپر تلے پیدا ہونے والے بچوں اور بہو کا ذکر کروا دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

ہماری محبت میں عشق کا سر پھرا پن ہے۔ ہم ایک دوسرے سے لڑتے بھی ہیں لیکن ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے، رُخسانہ کی محبت اور توجہ میری زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ ایک حوالے سے ہم دونوں آئیڈیل میاں بیوی ہیں۔[5]

مجموعی طور پر رشید امجد کا انداز روایتی قسم کا ہے، وہ اپنے بعض افسانوں میں بھی روایت اور پُرانی تہذیب سے جُڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کا اندازِ تحریر اصلاحی اور سبق آموز ہوتا ہے اور یہی اندازِ تحریر انہوں نے آپ بیتی میں اختیار کیا ہے۔ ان کی تصانیف کو پڑھ کر شُبہ ہوتا ہے کہ وہ نذیر احمد کی روایت کو آگے بڑھانے کی سعی کر رہے ہیں۔ تاہم کئی جگہ پر واقعات کے بیان میں طوالت لے آتے ہیں، جس میں خود وہ اور قاری اُلجھ جاتے ہیں۔ لیکن بلا شُبہ آپ بیتی کا وہ حصہ جہاں مصنف حلقہ اربابِ ذوق میں شمولیت، محفلوں میں شرکت اور حلقہ اربابِ ذوق سے منسلک احباب کا ذکر کرتے ہیں، وہ حصہ اِس آپ بیتی کو مالا مال کر دیتا ہے۔

بلا کم و کاست از مہدی علی صدیقی

مہدی علی صدیقی کا نام اُردو ادب کے چند اُن گنے چنے لوگوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی ساری زندگی اُردو ادب کی خدمات میں صرف کر دی۔ بنیادی طور پر وہ مملکت آصفیہ ریاست حیدرآباد میں سول سروس کے عہدے پر فائز تھے، اس کے علاوہ انہیں اُردو ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اُن کی وجہ شہرت ان کی معروف کتابیں توازن، مضامین ادراک، اشارے، نشانات اور جہات ہیں جو کہ موضوعات اور متن کے لحاظ سے انہیں باقی مصنفین سے ممتاز کرتی ہیں۔

مہدی علی صدیقی کی داستانِ حیات کا نام بلا کم و کاست ہے، جسے 2002ء میں شعبہ تصنیف و ترجمہ کراچی نے شائع کیا۔ 272 صفحات پر مشتمل اِس آپ بیتی میں مہدی علی صدیقی نے اپنی پیدائش سے لے کر حال تک کے تمام واقعات کو ترتیب کے ساتھ بڑے دل چسپ انداز میں لکھا ہے۔ آپ بیتی 35 ابواب پر مشتمل ہے اور آخر میں چار ضمائر دیئے گئے ہیں۔ آپ بیتی کو مصنف نے اپنی مرحومہ بیوی عزیز بانو کے نام منسوب کیا ہے۔ اس کے ساتھ فارسی زبان میں اُن کے لیے ایک قطعہ بھی لکھا ہے، جس سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے، جس کے حساب سے ان کا تاریخ وفات 1997ء کا سن ہے۔

مہدی علی صدیقی نے ملازمت سے فارغ ہو کر صحافت اور شعر و ادب میں اہم خدمات سر انجام دی ہیں۔ اِن کی شہرت کی دو وجوہات ہیں: پہلی وجہ ان کی اپنی تصانیف اور دوسری وجہ اردو ادب کے مشہور و معروف ادیب سعادت حسن منٹو کے ایک افسانے پر فحاشی کا مقدمہ دائر کرنے کی ہے، جس وجہ سے انہیں ادبی حلقوں میں پذیرائی ملی، منٹو نے خود انہیں اپنا محسن و مربی کہا، نیز اپنی ایک کتاب کو بھی اُن کے نام معنون کیا۔ آپ بیتی کے ابتدائی حصے میں مہدی علی صدیقی کا ایک بیان بہت اہمیت کا حامل ہے۔

> میں نے کوئی ڈائری نہیں لکھی۔ جو کچھ ضبط تحریر میں آیا ہے وہ محض حافظے کی مدد سے لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں غلطیوں کا امکان ہے مگر مجھے اطمینان ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اور جن واقعات کی تفصیل درج کی ہے وہ یا تو میرے علم میں ہیں اور صحیح ہیں یا جن کے متعلق مجھے ممکنہ طور پر یقین حاصل ہوا ہے اور اُن کے راوی قابلِ اعتبار احباب و اشخاص ہیں یا وہ متعلقہ زمانے میں زبان زد تھے اور جو میرے حد تک قابلِ یقین ہیں۔[6]

اِس بیان کے مطابق مصنف نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ آپ بیتی میں غلطیوں کا امکان ہے کیوں کہ وہ اپنی یاداشت پر بھروسہ کر کے لکھ رہے ہیں لیکن اگر دیکھا جائے تو ساری زندگی کے واقعات کو زمانی ترتیب اور واقعات کے بیان میں ترتیب رواں رکھنا ایک کٹھن کام ہے، لیکن اس کے باوجود مہدی علی صدیقی کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ممکنہ طور پر صحیح واقعات بیان کیے ہیں۔

بلا کم و کاست کے ابتدائی باب میں مصنف نے اپنی تاریخ پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے۔ ان کے مطابق ان کی پیدائش فروری 1907ء اور جائے پیدائش اورنگ آباد، ریاست حیدر آباد ہے۔ اس سلسلے میں مصنف یوں لکھتے ہیں کہ:

> میری پیدائش اورنگ آباد میں راجیشور راؤ کی ڈیوڑھی میں ہوئی۔ جو اس کے پانچ سال پہلے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے والد کے پاس کرائے پر تھی اور مولانا مرحوم وہاں پیدا ہوئے تھے۔ مرحوم کے والد اور میرے والد دونوں اورنگ آباد میں وکالت کرتے تھے اور دونوں میں بے تکلفانہ تعلقات تھے۔[7]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدی علی صدیقی کے والد پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے بعد ازاں انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ابتدا ءمیں وہ حیدرآباد کے ایک نامی وکیل فدا حسین خان کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ پھر ان کے تینوں بیٹوں کے بارے میں بھی معلومات لکھی ہیں، جن میں بڑا بیٹا ڈاکٹر ذاکر حسین ہندوستان کا صدر بنا، منجھلا بیٹا محمود حسین خان پاکستان بننے کے بعد کراچی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا اور تیسرا بیٹا یوسف حسین خان عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں تاریخ کا پروفیسر بنا۔

ابتدائی تعلیم کے بیان میں مولوی فضل اللہ صاحب کا واقعہ اور مولانا محمد علی کے اخبار ہمدرد کا مطالعہ بھی اُن کی بچپن کی یادوں میں شامل ہے۔ آپ بیتی میں مصنف نے پرائمری، مڈل اور میٹرک کی تعلیم کے لیے عابد روڈ پر واقع نارمل اسکول اور سٹی اسکول کا ذکر کیا ہے۔ آپ بیتی کا یہ باب پڑھ کر اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ مصنف نے مدرسہ فوقانیہ کے ہیڈ ماسٹر مُلا داؤد مرحوم کے کہنے پر جامعہ عثمانیہ سے ملحقہ فوقانیہ عثمانیہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے ایک ہم جماعت رشید ترابی کا نام لیتے ہیں جو کہ بعد میں پاکستان آ گئے اور خطابت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ 1923ء میں علی گڑھ میں داخل ہوئے اور یہاں سے ایف اے اور بی اے کا امتحان پاس کیا آپ بیتی کے چار ابواب میں علی گڑھ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں مصنف اُن اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں جن سے وہ متاثر تھے اُن میں احسن مارہروی اور رشید احمد صدیقی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نیز مصنف نے اس دوران ہونے والے مشاعروں، مذاکروں اور مباحثے کا بھی ذکر کیا ہے جو خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

والدین کا کردار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ والدہ علالت کی وجہ سے اُن کے بچپن میں ہی وفات پا گئی تھیں اور والد کے کردار کو مثالی بیان کیا ہے۔ والدہ کی وفات کے بعد اُن کے والد نے انہیں ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا اور ماں کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ آپ بیتی پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنے والد کے ساتھ بہت مانوس تھے اور اُن کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ کم عمری میں ایک ہی بستر پر والد کے ساتھ سونا، تانگے میں بیٹھ کر عدالت جانا، منشی اور دیگر اہل کاروں کے ساتھ بے تکلفی اور دل لگی بنالینا ان کی بچپن کی یادوں میں شامل ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے والد کی مہمان نوازی کا ذکر ان خوب صورت الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

> ہمارے ہاں اور بھی مہمان مدتوں رہتے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ والد مرحوم کثیر الاحباب تھے اور بامروت آدمی تھے۔ وہ اپنی مہمان نوازی کی وجہ سے معروف بھی ہو چکے تھے اور ہمارا گھر بھی ایسا تھا جس میں آسانی سے جگہ دی جا سکتی تھی۔ اکثر وہ عہدہ دار جو عارضی طور سے اورنگ آباد میں تعینات تھے۔ ہمارے ہاں ٹھہر جاتے۔ اُس زمانے کے حالات میں نہ یہ کوئی معیوب بات تھی، نہ کوئی ایسا غیر معمولی بار سمجھا جاتا تھا۔[8]

آپ بیتی کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اورنگ آباد سے گہری محبت تھی کیوں کہ ان کے مطابق 1917ء میں اُن کی عمر دس برس تھی، جب اورنگ آباد سے نکلے تھے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ آج بھی کچھ منظم اور غیر منظم یادیں ذہن کے کسی مخفی گوشے میں اورنگ آباد کے حوالے سے ہیں۔

آپ بیتی میں مصنف نے بعض جگہوں پر ایسے خوب صورت انداز میں خاکے پیش کیے ہیں کہ آنکھوں کے آگے تصویر اُبھر آتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> مولانا شوکت علی کی تقریر سے پہلے اُن کی شخصیت متاثر کرتی تھی۔ لحیم شحیم، قد آور، سر تا پا کھدر میں ملبوس مگر جذباتی انسان جن کو آسانی سے اُکسایا جا سکتا تھا۔ اُن کی آواز بھاری اور ہزاروں کے مجمع میں پہچانی جاتی۔ مضبوط جسم دیکھ کر یقین آجاتا کہ وہ کرکٹ کھیلتے ہوئے اپنے چھکے کے اسٹروک سے گیند کالج کی مسجد تک پہنچا چکے ہوں گے۔[9]

اِس بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنف کو فنِ خاکہ نگاری میں بہت مہارت تھی اور وہ خاکے کے بیان میں بہت باریکیوں سے کام لیتے ہیں۔ مصنف نے آپ بیتی میں سول سروس کا امتحان دینے اور بطور جج ہندوستان کے مختلف شہروں میں ملازمت کے دوران پیش آنے والے حالات و واقعات کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ اِن شہروں میں لنگسگور، گیر، علی گڑھ، جالنی، مومن آباد، حیدر آباد اور گلبرگہ کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ بیتی کے اِس حصے میں مصنف اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کو بیان کرتے ہیں، جس سے قاری کو اُن کی عادات کے بارے میں مزید معلومات ملتی ہیں۔ مصنف لکھتے ہیں کہ:

> مجھے گھوڑے کی سواری کا ہمیشہ شوق رہا۔ سول سروس کی تربیت کا یہ لازم جزو تھا، میں اور میرے ساتھی ہفتے میں دو دِن حیدر آباد کی فوج کے علاقے میں سواری سیکھنے جاتے اور واقعی بڑی حد تک یہ سواری، عام صحت برقرار رکھنے کے لیے بہت موزوں مشغلہ ہے۔ میں تو جہاں جہاں متعین رہا یا تو سول کلب میں ٹینس کھیلتا یا پولیس افسروں سے درخواست کرتا کہ وہ صبح کو گھوڑا سائیس کے ساتھ بھیج دیں اور میں گھنٹہ بھر سواری کر لیتا۔ گلبرگہ میں مہتمم پولیس (سپرنٹنڈنٹ) نے اس کا انتظام کیا۔[10]

آپ بیتی میں مصنف نے اپنے عہد کے سیاسی حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مصنف نے آپ بیتی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں مصنف اس عہد کو بیان کرتے ہیں جب وہ ہندوستان میں مقیم تھے اور دوسرے حصے میں اُس وقت کے واقعات درج ہیں جب وہ تقسیمِ پاکستان کے بعد کراچی میں مقیم ہو گئے۔ آپ بیتی کے پانچ ابواب ایسے ہیں، جن میں مصنف نے کراچی آمد، احباب سے ملاقاتیں اور وہاں پر در پیش واقعات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سیاسی حالات بیان کرتے ہوئے مصنف نے صدر ایوب خان کی حکومت اور بعد میں ان کے زوال کے واقعات کا بھی بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کے عروج اور جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کا ذکر کیا ہے۔ بھٹو کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> بعض معاملات میں بھٹو کا کردار واقعی قابلِ تعریف تھا۔ انہوں نے دو شادیاں کیں اور ایک خاتون کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اُن کی منکوحہ تھیں۔ گویا عقد اعلانیہ نہ کیا گیا، نہ تسلیم کیا گیا۔ اُن کے اور ساتھی لیڈروں نے جو کرسیِ اقتدار پر فائز ہوئے، عورتوں کے معاملے میں کوئی حدود سلامت نہ رہنے دی۔ بھٹو صاحب کی خود اعتمادی غرور کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ انہوں نے کرسی ہلا کر کہا تھا کہ یہ کرسی بہت مضبوط ہے اور دوسری مرتبہ کہا تھا I am not sadaat بزرگوں سے سُنا ہے کہ غرور اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ ایک اور نمایاں کمزوری کہیے یا جو بھی نام دیجئے، یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُن کے ساتھی لیڈر اعلانیہ قانون شکنی کے مرتکب ہوتے۔[11]

مصنف نے آپ بیتی میں صدر ضیاء الحق کے عہدِ حکومت کی مختلف پالیسوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی حمایت کی ہے۔ اس کے بعد مصنف نے آپ بیتی کے تیئیسویں باب میں امریکہ کے طور طریقوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کی معاشی اقدار، کھلے کلبوں میں شراب نوشی اور سرِ عام جنس پرستی پر مہدی علی صدیقی نے تنقید کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> میں بعض وقت سوچتا ہوں، جنسی بد عنوانی کی کثرت، عادات و جواز، آخر اس قوم و ملک کو عذابِ الٰہی کا نشانہ کیوں نہیں بنا دیتے۔ مگر یہ خیال اُس وقت کافور ہو جاتے ہیں جب دیکھتا ہوں کہ خیرات بھی اِس ملک میں عام تقریباً نا قابلِ یقین حد تک موجود اور زیرِ عمل ہیں۔ مجھے تو کوئی ہسپتال ایسا نظر نہیں آیا جس میں دو چار کمروں سے لے کر پورا ہسپتال متمول لوگوں کی امداد اور تعمیری اخراجات اور عطیات سے محروم ہو۔ غرباء کے لیے سرکاری، سستی اشیائے خورونوش کے لیے امدادی ٹکٹ، مفت سوپ کچن، شب گزارنے کے لیے بڑے شہروں میں مفت جائے قیام حکومت کی امداد سے دستیاب ہیں۔[12]

آپ بیتی کا یہ باب ایک طرح کا سفر نامہ بھی محسوس ہوتا ہے، جسے قاری پڑھ کر نہ صرف امریکہ کی سیر کرتا ہے بلکہ اس تہذیب کے اندر سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بلاکم و کاست میں مصنف اپنی داستانِ عشق کا ذکر کرنے کے ساتھ اسی عشق کا شادی میں بدل جانے کا بھی ذکر کرتا ہے۔ 1927ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کے گھر پر رہے اُس دوران ان کی بھاوج کی منجھلی بہن بھی یہاں رہ رہی تھی۔ مصنف کو پہلے خواتین کے ساتھ رہنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس وقت پیدا ہونے والے نسوانی جذبات اور دل کشی کو مصنف نے بیان کیا ہے، جو اس سے قبل کبھی محسوس نہیں کیے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

> حیدر آباد پہنچنے اور چھ سات دِن قیام کے بعد میں نے محسوس کیا کہ جب میں کھانا کھانے یا کسی اور کام سے اندر جاتا ہوں میری نظریں بلانیت اور مقصد اپنی بھاوج کی منجھلی بہن کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا احساس تھا جس کا مجھے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس تعلقِ خاطر سے پہلے خواتین میں کوئی دلکشی محسوس نہ کی تھی۔[13]

مصنف نے آپ بیتی میں اپنی شادی کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ اِس کے مطابق 8 نومبر 1934ء کو بھاوج کی اِسی منجھلی بہن سے مصنف کا نکاح ہو گیا اور وہ دونوں ساری زندگی کے لیے ایک رشتے میں بندھ گئے۔

آپ بیتی کے آخری حصے میں مصنف نے اپنے خاندان کا تعارف کروایا ہے، بچوں کے بارے میں بنیادی معلومات دی ہیں، نیز آخر میں منٹو پر کیے گئے مقدمے کی تفصیلات اور منٹو کی جانب سے لکھا گیا ایک مضمون "رودادِ مقدمہ" کے نام سے اور اپنا ایک خط بھی آپ بیتی میں شامل کیا ہے اس کے علاوہ آخر میں لکھی گئی کچھ اصناف جن میں حمد، نعت، مناجات وغیرہ شامل ہیں جو کہ مصنف کے اعلیٰ ذوق ہونے کو ثابت کرتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ آپ بیتی اُردو ادب کی چند اہم آپ بیتیوں میں شمار ہوتی ہے۔ مصنف نے اِس آپ بیتی میں ترتیب کو مدِ نظر رکھنے کے علاوہ صداقت کے پہلو کو سنبھالے رکھا ہے۔ منٹو پر لگنے والا فحاشی کا الزام اور منٹو کے خطوط آپ بیتی کی اہمیت میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ مصنف نے آپ بیتی میں اپنے شوق اور عادات کو بھی احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ قاری مصنف کے اُسلوب سے لطف حاصل کرتا ہے اور بے زاری کا احساس نہیں ہونے پاتا۔

اپنا گریباں چاک از جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال

ڈاکٹر جاوید اقبال کا نام اُردو ادب میں مشہور ہونے کی دو بڑی وجوہات ہیں، پہلی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اقبال کے فرزند ہیں اور دوسری وجہ اُردو ادب میں اُن کی اپنی ادبی شناخت ہے۔ اُردو ادب میں وہ اقبالیات کے علاوہ شاعری، سیاست، قانون اور فلسفہ کے میدان میں اپنی مثال آپ ہیں۔ زندہ رود، افکارِ اقبال، لمحاتِ جاوید، منٹو کی خاکہ نگاری اور مے لالہ فام جاوید اقبال کی چند اہم کتابوں میں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے ایک آپ بیتی اپنا گریباں چاک کے عنوان سے لکھی جو بہت مشہور ہوئی۔ یہ 288 صفحات اور 13 ابواب پر مشتمل ہے، جسے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے 2002ء میں شائع کیا۔ آپ بیتی کے پیش لفظ میں جاوید اقبال لکھتے ہیں:

> میں عمر میں پاکستان سے بڑا ہوں۔ میرے والد علامہ اقبال، ایک عظیم شاعر، فلسفی اور تصورِ پاکستان کے خالق سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کے فرزند ہونے کی حیثیت سے زندگی کے مختلف ادوار میں میرا ردِ عمل مختلف رہا ہے۔ بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے بُرا نہیں منایا کیوں کہ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ جوان ہوا تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا، تو مجھے بہت بُرا لگا۔ یہ میری انا کی نشوونما میں مداخلت تھی۔ اب بوڑھا ہو چکا ہوں، تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے۔ میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا۔ ہمیشہ چھوٹا سا بچہ ہی سمجھا گیا۔ یعنی تن آور درخت کے سائے تلے ایک ننھا پودا پروان چڑھتا ہے۔ وہ دراز قد ہو جائے، اپنی صورت نکال لے، تب بھی پودا ہی رہتا ہے اور بڑے درخت کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔[14]

آپ بیتی کے شروع میں ان تعارفی جملوں میں مصنف اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ مصنف کی پہچان ہمیشہ اپنے والد کی وجہ سے ہوتی رہی اور وہ اپنی الگ شناخت نہ کروا سکے۔ آپ بیتی میں بعض جگہوں پر وہ اپنا موازنہ اپنے والد سے کرتے ہیں اور خود کو بہت چھوٹا محسوس کرتے ہیں، اس بات کو قاری آپ بیتی پڑھ کر آسانی سے محسوس کر سکتا ہے۔

اپنا گریبان چاک اس وجہ سے بھی مقبول ہے کہ اس میں پاکستان کے قومی شاعر علامہ اقبال کے بارے میں ایسی معلومات دی گئی ہیں جو کہ عوام ماننے کو تیار نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ ایک متنازع کتاب کی حیثیت سے بھی جانی جاتی ہے، اس کتاب کے مصنف چوں کہ اقبال کی قربت میں رہ چکے ہیں۔ اس کے باوجود جو اُسلوب انہوں نے اختیار کیا ہے اس میں بہت سی خامیاں موجود ہیں۔ اِس آپ بیتی کے حوالے سے ناقدین کی آرا الگ الگ ہیں کچھ آپ بیتی کے اُسلوب کو پسند کرتے ہیں اور اِسے حقیقت پسند قرار دیتے ہیں لیکن کچھ اِس اُسلوب کے خلاف نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر انور محمود خالد ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> جاوید اقبال کا نفسیاتی المیہ یہ ہے کہ اُنہوں نے قدم قدم پر اپنا موازنہ اپنے والدِ گرامی سے کیا ہے اور ہر جگہ خود کو اُن کے مقابلے میں چھوٹا محسوس کیا ہے۔ حالانکہ جس طرح کسی باپ کے لیے یہ حقیقت باعثِ شرم نہیں ہوتی کہ اُس کا بیٹا زندگی کی دوڑ میں اُس سے آگے نکل گیا ہے، اِسی طرح کسی بیٹے کو بھی یہ حقیقت تسلیم کر لینے چاہیے کہ اُس کا باپ علمی و ادبی دُنیا میں اتنا بلند مقام رکھتا ہے کہ وہ چاہے بھی تو ان بلندیوں کو چھو نہیں سکتا۔[15]

اس رائے سے محسوس کیا جا سکتا ہے کہ مصنف یہ بات دِل سے ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ مصنف اور ان کے باپ کا آپس میں کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ مصنف بار بار خود کو اپنے والد کے مدِ مقابل کھڑا کرتے ہیں اور خود کو چھوٹا محسوس کرتے ہیں۔ آپ بیتی کے پہلے باب کا عنوان جنم پتری رکھا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی پیدائش کے تمام واقعات کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے لکھتے ہیں کہ:

> اپنی پیدائش کے عمل کو کوئی دیکھ تو نہیں سکتا۔ اس بارے میں خبر پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ میں کب اور کہاں پیدا ہوا؟ میری معلومات میرے والد کی ایک تحریر پر مبنی ہیں جس سے ظاہر ہے کہ میں پانچ اکتوبر 1924ء کو شب 9 بج کر 30 منٹ پر سیالکوٹ شہر میں پیدا ہوا۔[16]

آپ بیتی کے اِس باب میں مصنف نے اپنے بارے میں مزید معلومات دیتے ہوئے لکھا کہ میرے دادا نے میرا پہلا نام قمر الاسلام رکھا تھا لیکن یہ نام اُن کے والد کو میرے لیے پسند نہ آنے کی صورت میں جاوید رکھا گیا۔ آپ بیتی میں مصنف اپنی موسیقی سے رغبت کے بارے میں

بھی بیان کرتے ہیں۔ اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط کا ذکر کرتے ہیں، جو انہوں نے اپنے والد کو لکھا تھا اور ایک گراموفون لانے کی فرمائش کی تھی والد گراموفون تو نہ لائے لیکن "جاوید کے نام" کے عنوان سے ایک نظم ضرور لکھ کر لائے۔

آپ بیتی کے تیسرے باب جاوید منزل میں اپنے والد کی شخصیت کے چند ایسے پہلوؤں کا ذکر کیا ہے، جس سے عوام الناس بے خبر تھی۔ عام طور پر اقبال کے حوالے سے یہ بات مشہور ہے کہ وہ جس محفل میں جاتے اُن کا طوطی بولتا لیکن جاوید اقبال کے مطابق ان کے والد کم سخن تھے نیز اِس کے علاوہ وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اقبال کا رویہ جاوید اقبال کے ساتھ محبت والا نہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> اپنی زندگی مجھے والد نے شاذ ہی کوئی ایسا موقع دیا ہو گا جس سے میں اُن کی شفقت اور الفت کا اندازہ کر سکتا جو انہیں میری ذات سے تھی۔ باپ بیٹوں کو اکثر پیار سے بھینچا کرتے ہیں، انہیں چومتے ہیں لیکن مجھے اُن کے خدوخال سے کبھی اس قسم کی شفقت پدری کا احساس نہ ہوا۔ بظاہر وہ کم گو اور سرد مہر سے دکھائی دیتے تھے۔[17]

مصنف کے اس بیان سے ایک طرف محسوس ہوتا ہے جیسے اقبال ایک مثالی والد نہیں ثابت ہوئے لیکن دوسری جانب مصنف نے واقعات میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ جاوید کی مصوری میں دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اقبال نے دوسرے ملک سے آرٹ کے اعلیٰ نمونے منگوا کر دیئے، اقبال بے شک جاوید اقبال سے محبت کے دعوی دار نہیں تھے لیکن محبت کا اظہار کرواجاتے تھے۔

آپ بیتی میں جاوید اقبال نے اپنی والدہ کا کردار بھی پیش کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ والد سے زیادہ اپنی والدہ سے متاثر تھے۔ ان کے مطابق ان کی والدہ پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ خط پڑھ لکھ سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ مصنف نے ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانوں کا ذکر کیا ہے مصنف لکھتا ہے کہ:

> میری والدہ واقعی عمدہ کھانا پکانے کی ماہر تھی۔ والد کے مرغوب کھانے مثلاً پلاؤ، زردہ، مرغ قورمہ، شامی کباب، کریلے گوشت، آلو کا بھرتا، فرنی اور خمیری روٹیاں تو اکثر پکتے تھے۔ وہ خود ایسے کھانوں کی شوقین نہ تھیں۔[18]

جاوید اقبال نے آپ بیتی میں مختلف ممالک کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ اُن کی تہذیب و ثقافت کو بھی بیان کیا ہے جو کہ اِن کی آپ بیتی کی زینت میں اضافہ کرتی ہے، آپ بیتی میں امریکہ، برطانیہ، چین، ترکی، روس اور آسٹریلیا کی ثقافت کو مختلف کھانوں اور وہاں کے رسوم و رواج کے ذریعے بیان کیا ہے۔

خانہ آبادی کے نام سے ایک عنوان ہے، جس میں جاوید اقبال نے اپنی شادی اور اُس سے متعلق امور کو بیان کیا ہے۔ انگلستان سے واپسی پر جاوید اقبال کی شادی ہوئی ان کے مطابق اُن کی اہلیہ کا نام ناصرہ اقبال ہے۔ جاوید اقبال آپ بیتی میں اپنی اہلیہ کے اوصاف اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری کو گماں ہونے لگتا ہے کہ وہ اپنے والد سے زیادہ بیوی سے متاثر ہیں۔

جاوید اقبال نے آپ بیتی میں اپنے جج بننے کی تاریخ اور مشکلات کا بھی ذکر کیا ہے اُن کے مطابق وہ 1972ء کو چیف جسٹس ہائی کورٹ کے عہدے پر فائز ہوئے علاوہ ازیں 4 اکتوبر 1986ء کو وہ ہائی کورٹ چیف جسٹس کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ اس کے علاوہ تین برس تک عدالتِ اعظمیٰ میں بطور جج کام کیا اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

جاوید اقبال نے آپ بیتی میں سیاسی احوال بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے مدِ مقابل کھڑے ہو کر الیکشن بھی لڑے۔ ایک لمبی تعداد میں جاوید اقبال اُن سیاسی لیڈروں کا نام لیتے ہیں جن سے وہ بچپن سے لے کر آج تک ملے ہیں اور یہ حصے آپ بیتی کا بہت اہم ہیں، اِن میں شاہ حسین، اندرا گاندھی، فاطمہ جناح، سر راس مسعود، سروجنی نائیڈو، قائداعظم محمد علی جناح، چواین لائی اور پنڈت نہرو جیسے لوگ شامل ہیں۔

آپ بیتی میں مصنف جہاں اپنی سوانح بیان کرتے ہیں وہاں کچھ اچھی اور بُری عادات کا بھی بیان کرتے ہیں۔ والد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ فضول خرچی نہیں کرنے دیتے تھے اس لیے جاوید اقبال مہنگے کپڑے اور جوتے نہیں لے سکتے تھے لیکن والد کی وفات کے بعد اس پابندی سے بھی آزادی مل گئی۔ یوں لکھتے ہیں:

> والد کی وفات کے بعد میں ان کے نافذ کردہ ڈسپلن سے آزاد ہو گیا۔ جن باتوں سے انہوں نے منع کر رکھا تھا، میں نے بڑی رغبت سے اُن میں سے ہر ایک کو اپنایا۔ صحیح وغلط میں غلط اور نیکی وبدی میں بدی کا رستہ منتخب کرنا بہتر سمجھا۔[19]

اس بیان میں جاوید اقبال واضح الفاظ میں اپنی خامی کو قبول کر رہے ہیں جو کہ ان کی عظمت میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ آپ بیتی میں مصنف نے انگلستان سفر کے واقعات کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اس میں اپنی شخصیت کی کچھ کمزوریوں کا ذکر بھی کروایا گیا ہے۔ خود کلامی کے نام سے آخر میں جاوید اقبال نے اپنے خیالات اور مختلف آراء کا ذکر کرتے ہوئے مذہبی حوالے بھی دیئے ہیں۔ ایک جگہ پر لکھتے ہیں کہ:

> میں ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس لیے اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہوں۔ مذہبی فرائض انجام دیتا ہوں لیکن اُس حد تک جو میری فطرت قبول کرے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آج کے انسان کی مذہب پر وہ گرفت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ شخصی آزادی کے احساس نے مذہبی پابندیوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔[20]

اسی طرح آپ بیتی کا اختتام سورت الناس پر کرتے ہیں۔ جو اس بات کی طرف اشارہ دلاتی ہے کہ انسان ساری زندگی گناہ کرتا ہے اور آخر میں توبہ کا موقع چاہتا ہے اسی طرح کے ایک موقع کی تلاش میں جاوید اقبال بھی ہیں۔

جاوید اقبال کی آپ بیتی کے آخر میں قیامِ یورپ کے عنوان سے کچھ تصاویر ہیں جن پر کڑی تنقید کی گئی ہے، تصاویر کے انتخاب میں خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی جوانی کی بعض تصاویر موٹر کاروں پر اور خواتین کے ساتھ ہیں، جن سے مغرب کی طرف ان کے بڑھتے رجحان کا اندزہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر انور خالد اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> اپنا گریباں چاک کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے مصنف نے اپنی سرگزشتِ حیات سناتے کہیں بھی لاف زنی، دروغ گوئی، خبط عظمت کی نمائش اور اخفا سے کام نہیں لیا۔[21]

مجموعی طور پر اپنا گریباں چاک اُردو ادب کی ان معلوماتی آپ بیتیوں میں شامل ہوتی ہے، جس سے کسی شخصیت کے بارے میں اہم معلومات ملتی ہیں۔ دوسری اس آپ بیتی کے معروف ہونے کی ایک اہم وجہ فرزندِ اقبال ہونے کی حیثیت سے بھی مسلم ہے۔ تاہم اس آپ بیتی میں ایک بہت اہم اور معتبر شخصیت پر کچھ الزامات بھی لگائے گئے ہیں جن پر تنقید بھی کی گئی ہے لیکن وہ الزامات درست بھی مانے جاسکتے ہیں کیوں کہ جاوید اقبال فرزندِ اقبال ہیں اور انہوں نے باقیوں کی نسبت اقبال کو براہِ راست دیکھا ہے۔

دِل بھٹکے گا از احمد بشیر

احمد بشیر کا نام اُردو ادب میں کئی حوالوں سے اہم ہے، وہ بیک وقت ناول نگار، کالم نگار، فلم ساز، صحافی اور سیاست کے میدان میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کی وجہ شہرت جو ملے تھے راستے میں (خاکے) ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تخلیقات میں سے ایک آپ بیتی دِل بھٹکے گا بھی ان کی وجہ شہرت ہے، جو 2003ء میں فیروز سنز لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ آپ بیتی 890 صفحات اور 39 ابواب پر مشتمل ہے۔ اس آپ بیتی کی منفرد بات جو اسے دوسروں سے جُدا کرتی ہے، وہ اِس کا اندازِ تحریر ہے جو ناول سے ملتا جلتا ہے۔ ناول کے ہیرو کی طرح آپ بیتی کا بھی ایک مرکزی کردار جمال ہے، جو دراصل مصنف کی اپنی ذات ہے اور اس کے ساتھ پیش آنے والے حالات و واقعات مصنف کی اپنی زندگی کے حالات و واقعات ہیں۔ احمد بشیر اس سلسلے میں خود لکھتے ہیں کہ:

دِل بھٹکے گا میں نے کسی خلش سے مجبور ہو کر نہیں لکھی۔ میں ایک کاہل اور کام چور آدمی ہوں۔ تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کا شوق مجھے ہے اگرچہ فکشن میں نے کم ہی پڑھا۔ یہ ناول زندگی کی ناکامیوں، نارسائیوں اور گناہوں کا گوشوارہ ہے، جس پر میں کبھی شرمندہ نہیں ہوا۔ ایک عہد کی داستان ہے جو آہستہ آہستہ کھلا، اپنے زوال کے کمال کو پہنچا اور اب نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پائے رکاب میں۔ [22]

درج بالا پیرا گراف سے ہی نظر آتا ہے کہ مصنف کا اندازِ تحریر بہت منفرد اور انوکھا ہے، آخر میں مصنف نے سیدھا نہیں کہا بلکہ غالب کے شعر کا سہارا لے کر اپنی بات مکمل کی ہے۔

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھئے تھمے
نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مصنف نے اپنی سوانح بیان کرتے ہوئے پہلے باب میں اپنے ابتدائی حالات اور اپنے گاؤں کے بارے میں معلومات قاری کو فراہم کیں ہیں۔ اُن کے گاؤں کا نام نور پور تھا پھر اس گاؤں کا نقشہ کھینچتے ہیں، منظر میں جزئیات بیان کرتے ہوئے اپنے والدین کی معاشی حیثیت کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ اسکول داخلے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

اسکول میں پہلے دِن جمال نے کسی لڑکے سے بات نہیں کی۔ بسم اللہ اُسے پہلے آتی تھی لیکن پھر سے سکھائی گئی۔ شام کے چار بجے تک جمال ناک کی سیدھ میں تکتا رہا۔ دوسرا روز بھی شاید اسی طرح گزر جاتا مگر دوسرے روز جو لڑکا کلاس میں داخل ہوا، وہ ناک کی سیدھ میں تکنے والا نہیں تھا۔ [23]

مصنف کے اُسلوب میں چاشنی ہے جو کہ قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے، بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے اپنے دوستوں اور اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے بچپن کی عادات اور مزاج کے بارے میں بھی قاری کو معلومات دیتے ہیں۔ اس حوالے سے مصنف خود لکھتے ہیں کہ:

میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ آپ اس ناول کو کہیں کہیں سے دیکھ لیں۔ یہ آپ کے امن و سکون کو برباد نہیں کرے گا۔ اس میں کوئی خیال انگیز رومان نہیں ملے گا۔ یہ تصوف کی گپھا بھی نہیں جس میں آپ چھپ سکیں۔ اگر آپ کو چہروں کی بدلتی ہوئی حالت کا شوق ہے تو یہ ناول نہ پڑھیں کیوں کہ اِس کا مشاہدہ تو آپ کر چکے ہیں۔ ہاں اگر آپ اخلاقی آدمی ہیں تو اِس ناول کو ضرور پڑھیں کیوں کہ اِس میں بداخلاقی کی باتیں بہت ہیں۔ [24]

جیسا کہ مصنف کے بیان سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ بیتی میں غیر اخلاقی باتیں بہت ہیں اس کے علاوہ آپ بیتی میں جنسی واقعات کی بھی فراوانی ہے آپ بیتی پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف چھوٹی عمر میں ہی جنس پرستی کی طرف مائل ہو گئے تھے اس کی بڑی وجہ مغربی ادب کا مطالعہ ہے، جو کہ اِن کی شخصیت میں بگاڑ کا باعث بنی۔

مصنف نے آپ بیتی میں اپنی مختلف عادات کا ذکر کیا ہے، جن میں شراب پینا، لاہور میں طوائفوں کے اڈے پر جانا وغیرہ شامل ہے۔ یہ ایسی عادات ہیں جو کہ بطور مسلمان ہمارے اندر ہونا ایمان کی کمزوری کا باعث ہیں۔ تاہم مصنف نے اس کا بیان صداقت سے کیا ہے جو کہ مصنف کے کردار کو قاری کے سامنے مثبت انداز سے پیش کرتا ہے۔

مصنف نے آپ بیتی میں ادیبوں، شاعروں یا جہاں کہیں بھی اہلِ علم کا ذکر کیا ہے وہاں ایک مخصوص انداز میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ آپ بیتی میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

مگر لکھنے سے جمال کو خوف آتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ادیب خاص لوگ ہوتے ہیں۔ اُن کی شکل و صورت بھی عام لوگوں سے مختلف ہوتی ہے اور وہ نور پور جیسے معمولی قصبوں میں پیدا نہیں ہوتے، مگر اب جو اُس نے ادیب قریب سے دیکھے تو اُسے جھٹکا سا لگا۔ اُن کی باتیں پھس پھسی اور بے مغز تھیں۔ وہ بے معنی باتوں پر بڑی سنجیدگی سے بحث کرتے ہیں۔ [25]

مصنف نے آپ بیتی میں جو کردار پیش کیے ہیں وہ قاری کو اس طرح اپنے سحر میں لے لیتے ہیں کہ قاری خود اُن کے کرداروں کے ساتھ گھومتا پھرتا نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں مصنف ممتاز مفتی کا ذکر اس طرح کرواتے ہیں کہ:

جمال کو مفتی کے ہاں سے روٹی، سگریٹ اور ہمدردی مل جاتی تھی اور اس سے بڑھ کر اُس کی کوئی حاجت نہ تھی۔ ابھی اُس نے سوچنا شروع نہ کیا تھا۔ اُسے اِس عظیم آثار کا بھی احساس نہ تھا جو مفتی اپنی بیوی کی مرضی کے برعکس اُسے اپنے گھر میں رکھ کر کر رہا تھا۔ اُسے یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ میری روٹی اور سگریٹ سے مفتی کی تھوڑی سی تنخواہ پر کتنا بوجھ پڑتا ہے۔ [26]

اس بیان میں مصنف نے ممتاز مفتی کا جو کردار قاری کے سامنے پیش کیا ہے وہ مثبت ہے قاری کو کردار پڑھ کر اُس سے محبت ہوتی ہے۔ اس میں مصنف جمال کی بے حسی اور ممتاز مفتی کی شرافت کو بہت احسن انداز میں پیش کرتا ہے۔

آپ بیتی میں نہ صرف مصنف نے اپنی سوانح پیش کی ہے بلکہ سیاسی نکتہ نظر پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف ذوالفقار علی بھٹو سے واضح طور پر متاثر نظر آتا ہے۔ بھٹو کا سیاسی انداز مصنف کو پسند ہے اور مصنف بھٹو کے اخبار میں لکھنا اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ آپ بیتی میں مصنف نے بہت سارے سیاسی حلقوں کا ذکر کیا ہے اس کے علاوہ ستر کی دہائی میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کسان کانفرنس کی تفصیلات درج کی ہیں۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

گاڑی شام کو ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچی، جس شان سے مولانا بھاشانی کا استقبال ہوا، اُس کی تفصیل کے لیے وارث شاہ کا قلم درکار ہے۔ ہجوم کا یہ عالم تھا کہ آدمی آدمی سے الگ نظر نہ آتا تھا۔ لگتا تھا لاوے کا ایک دریا اُبل رہا ہے، جس کے لال لال انگاروں کے لالے کھلے ہوئے ہیں۔ [27]

عورتوں کے حوالے سے بعض واقعات میں مصنف عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک کرنے پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

نور پور کی لڑکیاں تو تھان پر بندھی ہوئی گائیں تھیں۔ اُن کو کبھی کسی نے انسان نہ سمجھا تھا۔ انہیں کبھی اچھے کپڑے نہیں ملے تھے۔ انہیں بچا کھچا کھانا کھلایا جاتا تھا۔ بیمار ہوتیں تو اُن کا علاج بھی کوئی نہ کرواتا۔ بڑی بوڑھیاں اُن کی ولادت پر ناک بھوں چڑھاتیں۔ [28]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو دِل بھٹکے گا سوانحی ناول کی طرز میں لکھی ہوئی آپ بیتی ہے، جو کہ مصنف نے ایک الگ اور اچھوتے انداز میں اس طرح پیش کی ہے کہ قاری اس کے سحر سے نکل ہی نہیں پاتا۔ فنی لحاظ سے آپ بیتی بلند مقام رکھتی ہے، جس میں مصنف نے جیتے جاگتے کردار پیش کیے ہیں، مناظر کا بیان بہت شان دار ہے، جزئیات نگاری کا استعمال ہوا ہے۔ اس لحاظ سے یہ آپ بیتی اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں ایک اہم اضافہ ہے۔

نشانِ جگر سوختہ از ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر اردو ادب میں مشہور افسانہ نگار، نقاد، مؤرخ اور ماہرِ اقبالیات کی وجہ سے مشہور ہیں۔ سلیم اختر کی مشہور کتابوں میں افسانہ حقیقت سے علامت تک، تنقیدی دبستان، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، ادب اور کلچر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تخلیق، تخلیقی

شخصیات اور تنقید شامل ہیں۔ نفسیاتی تنقید کے حوالے سے سلیم اختر کے نظریات اُردو ادب میں خاصے مقبول ہیں۔

نشانِ جگرِ سوختہ سلیم اختر کی آپ بیتی ہے جو کہ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے 2005ء میں شائع ہوئی۔ یہ آپ بیتی 312 صفحات اور 12 ابواب پر مشتمل ہے۔ آپ بیتی کا دیباچہ مصنف نے "سرِ بازار می رقصم" کے عنوان سے رکھا ہے، جو کہ حضرت سید عثمان مروندی المعروف لعل شہباز قلندر کی فارسی نظم سے لیا گیا ہے۔ آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ:

> تعلی میرے مزاج کا خاصا نہیں۔ مگر نشانِ جگرِ سوختہ کے بارے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح میں نے اپنی تحلیلِ نفسی کی اور کسی لکھنے والے نے خود کو نفسیات کے محدب شیشہ تلے یوں نہ رکھا ہو گا۔ اپنی تحلیلِ نفسی بھڑوں کے چھتہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔[29]

سلیم اختر ایک شاعر بھی ہیں جس کے عناصر اُن کی آپ بیتی میں صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس بیان میں مصنف کا اندازِ تحریر شاعرانہ ہے۔ آخری جملے میں تشبیہ کا استعمال کیا ہے کہ تحلیلِ نفسی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔

سلیم اختر نے آپ بیتی کے عنوانات منفرد اور مختصر استعمال کیے ہیں نیز انہوں نے آپ بیتی کے تمام واقعات میں سچائی بیان کرنے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ آپ بیتی کا آغاز بچپن کے واقعات سے ہوتا ہے۔ "فلیش بیک" کے عنوان سے سلیم اختر نے کچھ یادوں کا ذکر کیا ہے۔ آپ بیتی کے واقعات میں تیزی ہے کیوں کہ آپ بیتی کے آغاز میں ہی بچپن کے واقعات بہت مختصر بیان کیے ہیں۔ اپنی تاریخ پیدائش اور بزرگوں کا ذکر کرنے سے اجتناب کیا ہے والدین اور اُن کے چند بہت قریبی رشتہ داروں کا ذکر کیا ہے۔

ابتدائی تعلیم کے حوالے سے مصنف نے میکلورڈ روڈ پر واقع اسٹینڈرڈ سٹی اسکول اور اس اسکول سے وابستہ بہت سی یادوں کا ذکر کیا ہے۔ ان یادوں میں وہ اُن لڑکیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں، جو انہیں اس عمر میں پسند تھیں اور وہی آگے چل کر مصنف کی تحریوں کا حصہ بنیں۔ آپ بیتی میں مصنف اپنی پسند اور ناپسند کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ مصنف کو فوٹو گرافی کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ اس کے علاوہ پونا سے انبالہ کے سفر کی روداد تفصیل سے بیان کی گئی ہے، اس میں مصنف پونا اور انبالہ شہروں کا تقابل کرتے ہوئے انبالہ کو پسند نہیں کرتے لیکن انبالہ میں آموں کی کثرت کو مانتے ہیں۔

آپ بیتی میں مصنف اپنی ابتدائی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ادبی ذوق کے بارے میں بھی بیان کرتے ہیں، جو بچپن سے ہی پروان چڑھنے لگا تھا۔ پانچویں جماعت میں مصنف نے اپنا تخلص انجان لکھ کر شاعری کرنا شروع کر دی۔ شعری ذوق کے پروان چڑھنے میں مصنف نے اپنے والد کا کردار مثالی قرار دیا ہے، جو بچپن میں مصنف کو اپنے ساتھ مشاعروں میں لے جاتے تھے۔ آپ بیتی میں اپنے والد کا کردار اس طرح سے پیش کرتے ہیں:

> ابا جی وجیہہ انسان تھے۔ میں بچپن میں اپنے دوستوں کے سڑے بسے بد صورت باپ دیکھتا تو فخر سے سوچتا، ابا جی سب کے باپوں سے زیادہ خوب صورت ہیں۔ ویسے بھی چھوٹے بچے میں حس مبالغہ خاصی فعال ہوتی ہے۔[30]

اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا حسِ جمال بچپن سے ہی بہت اعلیٰ تھا، جس کی بنا پر مصنف اپنے باپ کو دوسروں سے زیادہ خوب صورت لکھتا ہے، دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جس طرح والدین کو اپنی اُولاد باقی سب سے زیادہ پیاری لگتی ہے اِسی طرح اُولاد کو بھی اپنے والدین باقی والدین سے زیادہ پیارے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا زمانہ دراصل ہندوستان میں وہ زمانہ تھا، جب تحریکِ پاکستان اپنے زوروں پر تھی۔ مصنف تحریک پاکستان کے بارے میں اپنے بچپن کی یادیں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

انبالہ سے ٹرین چلنے کا اعلان ہوا۔ شہر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر کوئی انبالہ سے نکلنے کو تیار۔ ایک رات ابا جی کا ایک سکھ دوست خود کو خطرات میں ڈالتے ہوئے یہ بتانے کے لیے ہمارے گھر آیا کہ آپ لوگ ٹرین سے مت جائیں۔ اِس پر حملے کا پروگرام بن چکا ہے۔ بعد میں اس ٹرین کی روانگی منسوخ کر دی گئی۔ حالات قدرے بہتر ہوئے تو سرکاری ملازمین کے لیے کوئی درجن بھر لاریوں کی کانوائے تیار کی گئی۔ [31]

آپ بیتی میں مصنف نے ہندوستان کے سیاسی شعور کو بہت اعلیٰ انداز میں پیش کیا ہے۔ جہاں مسلمانوں کی آنکھوں میں الگ ملک کے حصول کے لیے روشنی نظر آتی ہے، وہاں ان کو درپیش مسائل کا بھی ذکر کیا ہے جو مصنف کے سیاسی و سماجی شعور کو سامنے لے آتا ہے۔ اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں کہ:

کرپشن، رشوت، عدم عدل کی وجہ سے آج پاکستان کینسر کے مریض سے مشابہ نظر آتا ہے۔ تو یہی وہ ٹیڑھی اینٹیں ہیں، جن پر اِس ملک کی بنا استوار کی گئی۔ شہیدوں کے خون کے ساتھ بلکہ جس ارزاں نرخ پر خون شہداء کی سوداگری ہوئی وہ ہماری تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ [32]

بی اے کرنے کے بعد مصنف نے لاہور میں سائنس لائبریری میں ملازمت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف یہاں پر اپنی شادی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ بیوی کا نام سعیدہ لکھا ہے، جس سے ان کے خاندانی مراسم تھے، اس کے علاوہ شادی میں ہونے والے مسائل اور جھگڑوں کا بھی تفصیلاً ذکر ملتا ہے۔

ملازمت کے سلسلے میں مصنف 1962ء میں ایمرسن گورنمنٹ کالج ملتان میں لیکچرار رہے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار رہے۔ یہاں پر اس حصے میں مصنف نے اپنے طالب علموں کا ذکر کرنے کے علاوہ بطور اُستاد کلاس میں اپنا رویہ اور طلبہ کی بے تکلفی کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ پر لکھتے ہیں کہ:

لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں میں جمالیاتی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے لباس کے ساتھ اساتذہ کے لباس پر بھی توجہ دیتی ہیں۔ بلکہ بعض تو شرٹ کا اچھا رنگ، خوبصورت ٹائی یا اچھا کوٹ دیکھ کر خوش دِلی سے تعریف بھی کر دیتی ہیں۔ [33]

مصنف نے آپ بیتی میں ایک بڑی تعداد میں اپنے احباب کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں مسعود اشعر، مشفق خواجہ، شبنم شکیل، ایم سلطانہ بخش، قتیل شفائی، شاہین مفتی، فرمان فتح پوری،، یوسف کامران، کشور ناہید، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، انتظار حسین، مستنصر حسین تارڑ، سہیل احمد خان، انور سجاد اور اجمل نیازی وغیرہ شامل ہیں۔

آپ بیتی کے ایک حصے میں مصنف نے اپنی جوانی کے واقعات بیان کیے ہیں، جس میں وہ دوستوں کے ساتھ کی جانے والی عیش اور رنگینوں کا ذکر کرتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ ایسی جگہوں پر گئے جہاں سے پاک دامن واپس آنا ممکن نہیں، لیکن سلیم اختر یہ ماننے کو تیار نہیں بلکہ اپنی پارسائی کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بہت سارے مصنفین اس بات سے متفق نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں آپ بیتی میں بعض ایسے مقامات ہیں جہاں سلیم اختر نے خود اپنی عادات کا ذکر کیا ہے، جس پر بعد میں بہت تنقید کی گئی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

ہمیں راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑنے کی عادت تھی۔ محلہ میں بجلی کے کھمبے کے ساتھ ہماری ٹولی لڑکیوں کی منتظر رہتی۔ دوپہر کو چھٹی کے وقت جو لڑکیاں گزرتیں وہ بطورِ خاص ہدف ہوتیں۔ یوں ہی چھیڑ چھاڑ میں ایک لڑکی کو خط تھما دیا۔ جواب ملا اور یوں ہماری فلم شروع ہو گئی۔ [34]

اسی طرح کے جوانی کے واقعات مصنف نے آپ بیتی میں بیان کیے ہیں لیکن بعد میں اپنا دامن بچا کر الگ نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں جو صفائی مصنف نے پیش کی ہے وہ ناکافی ہے۔

مجموعی طور پر نشانِ جگرِ سوختہ آپ بیتی اُردو ادب کی چند اہم آپ بیتیوں میں شامل ہوتی ہے۔ اس میں مصنف نے نہ صرف اپنی سوانح بیان کی ہے بلکہ اپنے والدین، احباب کا بھی خاصا ذکر کیا ہے۔ مصنف نے اپنی تمام عادات کو بخوبی اس میں بیان کیا ہے۔ بیک وقت وہ سوانح کے ساتھ ساتھ اُس دور کے سیاسی و سماجی حالات کو بھی بیان کر رہے ہیں۔ اس سب کے بیاں میں مصنف کا اُسلوب افسانوی ہے جو کہ دلچسپی کا حامل ہے۔

خلاصہ کلام

رشید امجد کا انداز روایتی قسم کا ہے، وہ اپنے بعض افسانوں میں بھی روایت اور پُرانی تہذیب سے جُڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کا اندازِ تحریر اصلاحی اور سبق آموز ہوتا ہے اور یہی اندازِ تحریر انہوں نے آپ بیتی میں بھی اختیار کیا ہے۔ تاہم کئی جگہ پر واقعات کے بیان میں طوالت لے آتے ہیں، جس میں خود کو اور قاری کو اُلجھا دیتے ہیں۔ علی محمد صدیقی کی آپ بیتی اُردو ادب کی چند اہم آپ بیتیوں میں شمار ہوتی ہے۔ مصنف نے اِس آپ بیتی میں ترتیب کو مدِ نظر رکھنے کے علاوہ صداقت کے پہلو کو سنبھالے رکھا ہے۔ منٹو پر لگنے والا فحاشی کا الزام اور منٹو کے خطوط آپ بیتی کی اہمیت میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے آپ بیتی میں اپنے شوق اور عادات کو بھی احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ اپنا گریباں چاک اُردو ادب کی ان معلوماتی آپ بیتیوں میں شامل ہوتی ہے، جس سے کسی شخصیت کے بارے میں اہم معلومات ملتی ہیں۔ تاہم اس آپ بیتی میں ایک بہت اہم اور معتبر شخصیت پر کچھ الزامات بھی لگائے گئے ہیں، جن پر تنقید بھی کی گئی ہے لیکن وہ الزامات درست بھی مانے جاسکتے ہیں کیوں کہ جاوید اقبال فرزندِ اقبال ہیں۔ دِل بھٹکے گا سوانحی ناول کی طرز میں لکھی ہوئی آپ بیتی ہے، جو کہ مصنف نے ایک الگ اور اچھوتے انداز میں اس طرح پیش کی ہے کہ قاری اس کے سحر سے نکل ہی نہیں پاتا۔ فنی لحاظ سے آپ بیتی بلند پایاں مقام رکھتی ہے، جس میں مصنف نے جیتے جاگتے کردار پیش کیے ہیں، مناظر کا بیان بہت شان دار ہے۔ نشانِ جگرِ سوختہ آپ بیتی اُردو ادب کی چند اہم آپ بیتیوں میں شامل ہوتی ہے۔ اس میں مصنف نے نہ صرف اپنی سوانح بیان کی ہے بلکہ اپنے والدین، احباب کا بھی خاصا ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے اپنی تمام عادات کو بخوبی اس میں بیان کیا ہے۔ بیک وقت وہ سوانح کے ساتھ ساتھ اُس دور کے سیاسی و سماجی حالات کو بھی بیان کر رہے ہیں۔ اس سب کے بیاں میں مصنف کا اُسلوب افسانوی ہے جو کہ دلچسپی کا حامل ہے۔ یہ آپ بیتیاں اکیسویں صدی میں نئے آپ بیتی لکھنے والوں کے لیے اظہار کے کئی نئے زاویے اور راستے متعین کرنے اور کئی پامال راستوں کو چھوڑنے کا وسیلہ ثابت ہو سکتی ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

1 رشید امجد، ڈاکٹر، **تمنا بے تاب**، (راولپنڈی: حرف اکادمی، 2001ء)، ص7-
2 ایضاً، ص12-
3 ایضاً، ص176-
4 ایضاً، ص12-
5 ایضاً، ص174-
6 صدیقی، مہدی علی، **بلاکم وکاست**، (کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف ترجمہ، جامعہ کراچی، 2002ء)، ص1-
7 ایضاً، ص1-
8 ایضاً، ص4-
9 ایضاً، ص22-
10 ایضاً، ص117-
11 ایضاً، ص272-273-
12 ایضاًص336-
13 ایضاً، ص38-39-
14 جاوید اقبال، ڈاکٹر، **اپنا گریباں چاک**، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء)، ص8-9-
15 انور محمود خالد، ڈاکٹر، **اپنا گریباں چاک**، (مشمولہ سہ ماہی معاصر، جلد4، اپریل تا دسمبر2004ء)، ص547-548-
16 جاوید اقبال، ڈاکٹر، **اپنا گریباں چاک**، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء)، ص11-
17 ایضاً، ص28-
18 ایضاً، ص32-
19 ایضاً، ص46-47-
20 ایضاً، ص285-
21 انور محمود خالد، ڈاکٹر، **اپنا گریباں چاک**، (مشمولہ سہ ماہی معاصر، جلد 4، اپریل تا دسمبر 2004ء)، ص 548-549-
22 احمد بشیر، **دِل بھٹکے گا**، (لاہور: فیروز سنز، 2003ء)، ص 8-
23 ایضاً، ص 84-
24 ایضاً، ص 8-9-
25 ایضاً، ص366-
26 ایضاً، ص359-
27 ایضاً، ص722-
28 ایضاً، ص96-
29 سلیم اختر، ڈاکٹر، **نشانِ جگرِ سوختہ**، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2005ء)، ص18-
30 ایضاً، ص24-
31 ایضاً، ص76-77-
32 ایضاً، ص58-59-
33 ایضاً، ص60-
34 ایضاً، ص102-